نقشِ ثانی پر

ایک نظر

حضرت مُنیرؔ واحدی

می شود پردہ چشم پرِ کاہے گاہے
دیدہ ام من دو جہاں را بہ نگاہے گاہے — اقبالؒ

معاشرہ میں سب سے حساس طبقہ شعراء کا ہے۔ اس کی حیثیت آنکھ کی ہے۔ کبھی تو وہ اپنی خودی میں گم رہتا ہے اور کبھی چونکتا ہے تو بیک نظر حیات و کائنات کا جائزہ لینے میں محو ہو جاتا ہے۔

فن مصوری، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح شاعری انسان کے لطیف احساسات و جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہے، خواہ وہ داخلی محرکات کی مرہونِ منت ہو یا خارجی تاثرات کا نتیجہ۔ انداز بیان میں ندرت، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی، اور ربط و تسلسل اس کا جوہر ہیں۔ شاعر کا ذوقِ سلیم فن میں اک خاص نکھار پیدا کرتا ہے۔ شاعری جب فن کے حدود و قیود میں پروان چڑھتی ہے تو اس میں سحرِ حلال کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ماحول سے متاثر ہونے کی صلاحیت، "تنقیدی جائزہ" اور قدرتِ بیان لازمی ہیں ورنہ کلام میں محفل گدازی کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ معاشرہ کے تیز رو دھارے میں شاعر کا تخیل وقت کے رحم و کرم پر

بہتا نظر آتا ہے۔ کلام میں حُسن تو پیدا ہو سکتا ہے مگر اسے بلیغ، بامقصد اور نظریاتی شاعری نہیں کہہ سکتے۔ غمِ عشق کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کا پہلو افادی نقطہ نظر سے ضروری ہے۔

بیسویں صدی میں دنیائے شاعری میں رونما ہونے والے ذہنی و فکری انقلاب سے دورِ جدید کے شاید ہی کسی شاعر کا دامن محفوظ ہو۔ قسیم صاحب بھی محسوس یا غیر محسوس طور پر اس سے متاثر ہیں وہ جوان العمر ہوتے ہوئے بھی صالح فکر و نظر کے حامل ہیں۔ ان کے کلام کا جائزہ لینے پر محسوس ہوتا ہے کہ وہ روایتی غزل گوئی سے ہیئت کی حد تک تو وابستہ ہیں مگر تخیلی اعتبار سے حیات کے صالح تقاضوں سے اغماض نہیں کرتے۔ وہ دین و سیاست کو جداگانہ شے نہیں سمجھتے بلکہ ایک شے تصور کرتے ہیں جو مختلف زاویۂ نظر سے دیکھنے پر جداگانہ معلوم ہوتی ہے۔ اشعار ابتذال و رکاکت سے پاک ہیں۔ حیات کی منفی قدروں کی ترجمانی سے انہیں پرہیز ہے جذبات کے اظہار میں تہذیب کے حدود و قیود کا لحاظ رکھتے ہیں اگر کہیں شدتِ تاثیر کی کمی محسوس ہوتی ہے تو اس کا سبب ان کا وہ صالح فکری تصور ہے جو انہیں اپنے علم اور ماحول سے ملا ہے۔ ادب کی خدمت ان کا ایمان ہے۔ وہ ایک محتاط اور بالغ النظر شاعر ہیں۔ فنِ سخن کی شائستگی کے ساتھ ساتھ تعمیری اور مثبت شاعری کے قائل ہیں۔ انتہائی روایتی قسم کی شاعری سے انہیں گریز ہے۔ خدا نے انہیں ذوقِ سلیم عطا کیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے کلام میں جدت، ندرت، حسنِ تغزل، تعمیری رجحان، سادگی و شگفتگی سب کچھ ہے، ہماری مزید توقعات ان سے وابستہ ہیں۔

ان کے چند اشعار پیشِ خدمت ہیں تاکہ ان کے مقام کا تعین کرنے میں قارئین کو آسانی ہو۔

محبوب سے دوری کا تصور نہایت روح فرسا ہے۔ ہجر کا ہر لمحہ طولِ ابد کا حامل

اور جاں کاہ ہے۔ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ اضطرابِ شوق میں بقول مرزا غالبؔ ع

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

ملاحظہ فرمائیں قسیمؔ صاحب کے یہاں اس کا تصور کتنا شدید ہے ؎

گردشِ زمیں کی وقت کی رفتار رُک گئی
محسوس یہ ہوا ہے ترے انتظار میں

دَورِ جدید نے ظلم و ستم کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ دورِ بربریت میں بھی دشمن پر غفلت میں وار کرنا اور اپنے سے کمزور و نحیف پر ہاتھ اُٹھانا جوہرِ شجاعت کے منفی تصور کیا جاتا تھا۔ مگر آج تو تعصب نے وہ گل کھلایا ہے کہ بلا امتیاز ہر فرد و بشر ستمِ ناروا کا نشانہ ہے۔ کیا خوب شعر کہا ہے ؎

کلی کلی ہدفِ باغباں ہے آج قسیمؔ
گلوں پہ کل بھی تھا گلچیں کا وار گلشن میں

عقلِ حیلہ ساز نے تعمیر کے پردے میں تخریبی کارنامے خوب انجام دیئے۔ ذہانت نے انسان کو مشینی ترقی کی بنیادوں پر کائنات کے حُسن میں اضافہ کا ڈھونگ تو خوب رچایا مگر اس کے معکوس اندازِ فکر نے ایسے مہلک اسلحے ایجاد کئے کہ دنیا جہنم زار بن گئی۔ قسیمؔ صاحب نے اس خیال کی کیا خوب ترجمانی کی ہے ؎

جنت تو نہیں بن سکی اے عقل یہ دنیا
ہاں کھول دیا تو نے جہنم کا دہانہ

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا، بحرِ حوادث کی موجوں کی طغیانی کو کم نہیں کر سکتا پُرامن مقاصد کے لئے شر انگیز ماحول کے خلاف صف آرائی اور چراغِ بولہبی سے شرارِ مصطفوی کا

دست و گریباں ہونا ضروری ہے ورنہ آلام و مصائب میں اضافہ ہی ہوگا۔ تیرگیِ شب کا شکوہ عبث ہے۔ چراغ عزم و عمل سے اسے دُور کر سکتے ہیں۔ نسیم صاحب اپنے ایک شعر میں کس خوبی سے اس جانب توجہ دلاتے ہیں ؎

آمادۂ پیکار ترا دل تو ہو پہلے
پھر دیکھ ترے سامنے شب ہے کہ سحر ہے

معاشرہ راہ رَو ہے اور شاعری راہبر۔ صرف داد طلبی اور بزم آرائی اس کا مقصد نہیں ہے۔ بلکہ غم حیات کی چارہ سازی بھی ضروری ہے۔ نہایت دیانت داری کے ساتھ تہذیب اخلاق کا درس دینا شاعر کا فرض ہے ؎

شعر شمع رہِ حیات بھی ہے
شاعری صرف واہ واہ نہیں

تہذیب جدید نے انسان کے ظاہر و باطن میں آسمان و زمین کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ آراستگیِ فکر و نظر تو افسانہ و افسوں ہے۔ محض تن پروری اور دکھاوے کا دَور ہے۔ دلوں کے زخم تازہ ہیں۔ مگر انسان عارضی مسرتوں کے تصور سے خود کو فریب دیتا ہے کس خوبی سے اس شعر میں اس خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

نئی تہذیب کے پردے پڑے ہیں ایسے عقلوں پر
کہ انساں غمزدہ ہو کر سمجھتا ہے کہ شاداں ہے

غم و آلام کی اگر شرح ممکن ہو تو اسے غم و آلام کیوں کر کہہ سکتے ہیں۔ شدتِ غم کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر اس کا اظہار محال ہے، کس خوبی سے اس مضمون کو باندھا ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

کیا حال نسیم کشتۂ غم تم پوچھتے رہتے ہو ہمدم
جو دل پہ گزرتی ہے اس کے کہہ دینا تو آساں کام نہیں

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے مصداق اپنی ہستی کے عرفان میں ذات باری تعالیٰ کا عرفان پنہاں ہے۔ دیر و حرم تو مقام جستجو ہیں اپنی کھوج لگانا کمالِ زندگی ہے۔ منزل تو اسی جستجو کا تتمہ ہے، مضمون بندی ملاحظہ فرمائیں ؎

ڈھونڈھتے ہیں ہم خود اپنے کو، کہاں ہم کھو گئے
جستجو دیر و حرم کی ہے نہ منزل کی تلاش

عرفی شیرازی نے کیا خوب کہا ہے ؎

بہر نعیم بہشت طاعت ایزد مکن
بر لب جیحون خطاست چشم بہ نم داشتن

کمالِ زندگی دیدارِ ذاتِ خداوندی ہے، اور وہ بغیر محبوب حقیقی کی رضا جوئی کے ناممکن ہے۔ عبادت میں مئے انگبیں کی لاگ تو ریاکاری ہے۔ اس کا قرب اور دیدار ہی جنت ہے۔ نسیم صاحب نے اس مضمون کو کس انداز سے باندھا ہے ملاحظہ فرمائیں ؎

ہاں عشق کیجئے کہ ہے معشوق رو برو
ہرگز نہ حرصِ باغِ ارم آپ کیجئے

محبوب کا سامنا بھی اہل شوق کے لئے قیامت کی گھڑی سے کم نہیں۔ رعب حسن سے یہ عالم ہے کہ اضطراری طور پر بجائے شکوہ کے تعریف و توصیف پر اتر آئے، نگاہ حسن کی افسوں طرازی اسے کہتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

شکوہ کرنا تھا ادا کرنے لگا میں شکریہ　　چل گیا اس کی نگاہوں کا فسوں تو کیا کروں

اہلِ عقل تو صنم خانۂ سود و زیاں اور بُت خانۂ چشم و گوش میں مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ غبارِ راہ کو منزل تصور کرنے والوں کو منزل کی جستجو کیا ہو گی۔ اہلِ جنوں حیات و کائنات کو آنی و فانی تصور کرتے ہیں اور ہستی کا عظیم مقصد حصولِ منزل کو قرار دیتے ہیں۔ شہرستان رنگ و بو سے نکل کر تلاشِ محبوب حقیقی میں صحرا صحرا مارے پھرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس تخئیل کی وضاحت اس شعر میں خوب کی گئی ہے ؎

قدرداں ہیں دشت و صحرا کے تو کچھ اہلِ جنوں
عقل والے کس لئے سوئے بیاباں آئیں گے

ضبط شرطِ وفا سہی۔ مگر اضطرابِ شوق میں اکثر دامنِ صبر و شکیب ہاتھوں سے جاتا رہتا ہے۔ گردشِ مدام سے گھبرانا فطرتِ انسانی ہے۔ بقول مرزا غالب ع

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

ایک ذی حس پیکر پر اضطراری کیفیت کا طاری ہونا بعید از قیاس نہیں۔

نسیم صاحب کے یہاں یہ مضمون جس رنگ میں بندھا ہے قابلِ دید ہے ؎

ضبطِ غم کی سعی تو کرتا ہوں لیکن دوستو!
دیدۂ تر کھول دے رازِ دروں تو کیا کروں

رندی و مستی میں پاکیِ طینت اور بلندیِ کردار لازمی شے ہے۔ لذتِ گنہ کے لئے ترستی ہوئی رندی تو بوالہوسی کے مترادف ہے۔ اس دور میں رندوں کے جذبات میں وہ پاکیزگی کہاں جو اگلوں کا شیوہ تھا۔ اب تو زیادہ تر فریبِ نظری ہے شاعر نے خوب مضمون باندھا ہے ؎

ارمانِ گنہ رند کے دل میں ہیں دو گونہ　　　احساسِ گنہ عقل کو یک گونہ اگر ہے

گلچیں کا کام گلوں کو شاخ سے جدا کرنا تو ہے مگر احتیاط کے ساتھ۔ یہ اتنا بھی خودکام نہ ہو کہ چمن کی ویرانی کا باعث بن جائے۔ دورِ جدید میں چمنستانِ سیاست کے گلچینوں کا رویّہ قابلِ گرفت ہے۔ مضمون کی خوبی، طرزِ ادا کی سادگی اور شدتِ تاثر ملاحظہ ہو ؎

گل چیں طلبِ گل میں تو دیوانہ ہے لیکن
پروا چمنستاں کی اسے خاک نہیں ہے

محبوب کی کافرماجرائی اور دزدیدہ نگاہی اس قدر پُرفریب ہے کہ تلخ تجربات کے باوجود اس کی وفا پر یقین آجاتا ہے اور اس کے لئے آسمان سے تارے توڑ لانے کی خواہش دل میں کروٹیں لینے لگتی ہے ؎

چاہتا ہے دل کہ تارے آسماں سے توڑ لائے
ہائے اس کافر کی دزدیدہ نگاہوں کا فریب

پارسائی میں رنگینیٔ حیات کا تصور خلافِ واقعہ ہے، زہد و پارسائی کی زندگی ایک کڑوا گھونٹ ہے اس کی تلخیاں جان لیوا ہیں، زندگی کے لمحات کاٹے نہیں کٹتے۔ عام لوگوں کے بس کا روگ نہیں لہٰذا گناہ نہ سہی فریبِ گناہ ہی سہی ؎

پارسائی میں بھلا کیسے کٹے گی زندگی
دل کے بہلانے کو کچھ تو ہو گناہوں کا فریب

عصرِ حاضر کے مادی ارتقاء نے فاصلہ اور وقت کو گھٹا کر انسانی برادری کو ایک کنبہ کی شکل میں تبدیل کر دیا۔ مگر ساتھ ہی دلوں کے درمیان نفرت کی آہنی دیواریں بھی کھڑی کر دیں، اور انسان کو صفتِ انسانیت سے عاری کر دیا۔

قومی ونسلی امتیازات شدید سے شدید تر ہو گئے۔ ہر ذی حس انسان اس کے تصور سے نالاں ہے اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے ؎

آدمی کو آدمی سمجھو قسیمؔ
کرتے ہو کیوں ہندی و شامی کی بات

منیر واحدی عفی اللہ القوی

۱۷؍ اگست سنہ ۶۰ء